سید کامران عباس کاظمی
لیکچرر، شعبۂ اردو،
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

مضامین منٹو میں عصری آگہی

Syed Kamran Abbas Kazmi
Lecturer, Departmet of Urdu,
International Islamic University, Islamabad

Contemporary Consciousness in Manto's Essays

Saadat Hasan Manto is a prominent short story writer. Historians of Urdu literature can not overlook Manto due to so many reasons but noteworthy reason is that his writings replicate the issues of his epoch. That does not only relate to his short stories but it is fact that his sketches, plays and essays also present the issues of his era .Manto's work encircles variety of topics, grave and humor both but he does not ignore the issues of his society and describes even in a few sentences ,that reflects his concern with society. In this thesis Manto's awareness and conciseness regarding his society has been discussed.

سعادت حسن منٹو اردو کے انتہائی اہم افسانہ نگار ہیں ۔ افسانے کی تاریخ مرتب کرتے وقت کسی بھی صورت منٹو کا نام نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔اُس کے یوں تو بہت سے اسباب ہیں لیکن بڑا سبب یہی ہے کہ منٹو نے اپنی تحریروں میں کسی بھی جگہ عصر کی ترجمانی سے روگردانی نہیں کی۔یہ بات اُن کے افسانوں کے حوالے سے ہی درست نہیں ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ افسانہ ہو یا خاکہ،ڈرامہ ہو یا مضمون منٹو کے پیشِ نظر ہمیشہ اپنا عہد اور اس کے مسائل ہی رہے ہیں۔منٹو کے مضامین میں ہر طرح کے موضوعات شامل ہیں۔ ان میں سنجیدہ موضوعات بھی ہیں ، طنز ومزاح بھی ہے اور محض انشاپردازی بھی۔لیکن منٹو کسی بھی صورت میں اپنے گردوپیش کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتے چاہے وہ دو یا چار جملوں پر ہی اکتفا کریں مگر اپنے عہد سے اُن کی وابستگی ہر صورت عیاں ہوکر رہتی ہے۔

منٹو نے جس زمانے میں لکھنے کا آغاز کیا اُس عہد میں ادب میں اشتراکی نظریات در آنے لگے تھے۔ انقلاب روس سے نہ صرف ادب متاثر ہوا بلکہ زندگی کے دیگر شعبے مثلاً سیاست،اقتصادیات اور سماجی شعبے بھی متاثر ہوئے تھے۔منٹو نے بھی اپنی ادبی زندگی کا آغاز روسی تخلیقات کے تراجم سے کیا۔اس طرح ادب میں اشتراکی نظریات کی ترویج کا اُنھوں نے براہ راست مطالعہ

کیا۔ان کی افتادِطبع سے پتا چلتا ہے کہ وہ روسی انقلاب سے متاثر تھے اور ادب میں اشتراکی نظریت کی ترویج کے خواہشمند تھے ۔ جب منٹو نے افسانے لکھنے شروع کیے تو اِن نظریات کا اظہار اُن کے افسانوں میں بھی ہوا۔منٹو کے مضامین کے عمومی موضوعات سماجی گھٹن اور سیاسی بے چینی پر مشتمل ہیں۔ بعد ازاں اُن کی تخلیقات میں ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ کے نفسیاتی نظریات بھی جگہ پانے لگے اور نفسیاتی مسائل کی مختلف صورتوں کو منٹو نے بڑی بے باکی سے اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا ہے۔

مغربی علوم وفنون کی ترویج نے بھی زندگی کو ایک نیا زاویۂ نگاہ دیا اور مختلف سیاسی،سماجی اور تمدنی نظریات برصغیر کے فرسودہ اور پرانے نظریات کو بدلنے لگے اس طرح ہندوستان کے لوگوں میں آزادی اور ترقی کا شعور بیدار ہونے لگا۔منٹو کے مضامین کے موضوعات میں تنوع اس بات کی دلیل ہے کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں کا گہرا ادراک رکھتے تھے۔ اُن کے مضامین میں روح عصر کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔مثلاً ادب میں مقصدیت سرسید کے عہد سے ہی شامل ہوگئی تھی مگر اسے باقاعدہ منشور کے طور پر ترقی پسند تحریک نے اپنایا اور جدید یا نئے ادب کے پیمانے مقرر کیے۔ادب اور زندگی کے باہمی ربط کی اہمیت واضح کرتے ہوئے معروف ترقی پسند نقاد اختر حسین رائے پوری ادب کا بنیادی مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ادب کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان جذبات کی ترجمانی کرے جو دنیا کو ترقی کی راہ دکھائیں۔ ان جذبات پر نفرین کرے جو دنیا کو آگے نہیں بڑھنے دیتے اور پھر وہ اندازِ بیان اختیار کرے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آسکے۔کیوں کہ بہر حال زندگی کا مقصد یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا زیادہ سے زیادہ بھلا کر سکے۔[۱]

ادب کے اس افادی پہلو کا منٹو ذرا بلند آہنگ لہجہ میں یوں اظہار کرتے ہیں:

> ہر ادب پارہ ایک خاص فضا ایک خاص اثر،ایک خاص مقصد کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس میں وہ خاص فضا ایک خاص اثر اور وہ خاص مقصد محسوس نہ کیا جائے تو وہ ایک بے جان لاش رہ جائے گی۔[۲]

گویا منٹو کے نزدیک ادب میں روح عصر کا احساس لازم ہے کیونکہ ادب اپنے عہد کا عکاس ہوتا ہے۔ترقی پسندوں نے ادب کو سماجی زندگی کی پیداوار سمجھا اور اس بات پر زور دیا کہ ادب کو سماجی زندگی بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلنا چاہیے۔ترقی پسندوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ ادب تنقید حیات ہونے کے ساتھ ساتھ سماج میں انقلابی تبدیلی بھی پیدا کرتا ہے۔لیکن کیا ادب کو اپنے عہد کی عکاسی کے علاوہ آئندہ کا لائحہ عمل دینا چاہیے؟ اس سوال کا جواب اختر حسین رائے پوری نے یہ کہہ کر دیا تھا کہ ''ادب کو تدریسیت سے کوئی واسطہ نہیں۔''اسی بات کی وضاحت منٹو اس طرح کرتے ہیں:

> ہم قانون ساز نہیں،محتسب بھی نہیں۔احتساب اور قانون سازی دوسروں کا کام ہے۔ ہم حکومتوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن خود حاکم نہیں بنتے۔ہم عمارتوں کے نقشے بناتے ہیں لیکن معمار نہیں۔ہم مرض بتاتے ہیں لیکن دوا خانوں کے مہتمم نہیں۔[۳]

اردو ادب میں مقصدیت کی رو دراصل سرسید کی اصلاح پسندی کی تحریک سے بھی متاثر تھی۔سرسید تو بہرحال ایک مصلح کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے رفقاء کے پیش نظر بھی اصلاح کا جذبہ ہی کارفرما تھا۔ترقی پسندوں کے ہاں یہی اصلاح پسندی ایک مختلف روپ میں ظاہر ہوئی یعنی انہوں نے اپنے آدرش وضع کیے اور اُن کے حصول کے لیے ادب کو استعمال کرنے کی شعوری کوشش

کی۔منٹو کہیں بھی مصلح نہیں بنتے اصلاح کرنا کبھی اُن کا مطمع نظر نہیں رہا۔ اپنے افسانے ''دھواں'' کے مقدمے کے سلسلے میں بیان صفائی میں منٹو کا کہنا ہے ۔''میں نے اس کہانی میں کوئی سبق نہیں دیا،اخلاقیات پر کوئی لیکچر بھی نہیں۔کیونکہ میں خود کو نام نہاد ناصح یا معلم اخلاق نہیں سمجھتا۔''[۴]

ترقی پسند تحریک نے کسی صالح انسان کے تصور کے بجائے سیاسی انسان اور فطری انسان کا تصور دیا۔اس سے قبل انسان یا نیک تھا یا پھر بدی کا مجسمہ ۔مثلاً پریم چند کا ہی تصورِ انسان دیکھ لیجئے۔ممتاز شیریں کی رائے اس بارے میں زیادہ دقیع ہے:

> پریم چند کے افسانوں اور ناولوں کو لے لیجئے ۔ان میں انسان نیک ہیں تو بہت ہی نیک ہیں، برے ہیں تو بہت ہی برے ہیں،عام طور پر غریب کردار اور گاؤں کے کردار بہت ہی معصوم اور بھولے بھالے ہوتے ہیں۔[۵]

منٹو کے معاصرین مثلاً کرشن چندر، بیدی اور قاسمی وغیرہ کے ہاں انسان کا سیاسی تصور ہے۔اس کی شخصیت کا انحصار سماجی اور سیاسی نظام پر ہوتا ہے۔یعنی نظام بدلنے پر انسان بدل سکتا ہے۔البتہ منٹو کے تصورِ انسان پر بات کرتے ہوئے ممتاز شیریں ان کے تصورِ انسان کو ارتقاء پذیر سمجھتی ہیں۔وہ مزید لکھتی ہیں ''منٹو کا انسان پہلے فطری انسان تھا۔فطری انسان جو ہر قسم کی سماجی اور اخلاقی بندشوں سے آزاد ہو کر فطری جبلتوں کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے ۔''[۶] اسی بات کو قدرے وضاحت سے وارث علوی نے یوں لکھا ہے۔''منٹو انسان کو صرف سیاسی اور اقتصادی اکائی کے طور پر نہیں دیکھتا۔وہ انسان کو اُس کی کلیت میں، فطرت اور کائنات کے تناظر میں دیکھتا ہے اور اُس کی نفسیاتی اور جبلی گہرائیاں کھنگالتا ہے۔''[۷] یہ بات درست ہے کہ منٹو انسان کے فطری تقاضوں اور جبلتوں کو اہمیت دیتے ہیں مثلاً محبت کا جذبہ منٹو کی نظر میں جیسا ایک عام لڑکی میں ہوسکتا ہے ویسا ہی ایک ویشیا کے پاس بھی ہوسکتا ہے یا پھر صورت یوں بھی ہوسکتی ہے''ایک باعصمت عورت کے سینے میں محبت سے عاری دل ہوسکتا ہے اور اس کے برعکس چکلے کی ایک ادنیٰ ترین ویشیا محبت سے بھرپور دل کی مالک ہوسکتی ہے۔''[۸]

بیسویں صدی میں نئے ادبی نظریات کی ترویج سے قبل عموماً ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کے نزدیک ادب زندگی اور سیاست سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا تھا۔سیاسی سماجی مسائل کا اظہار ادب میں ہوتا ہی نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تھا تو اس کی اہمیت نہیں تھی۔یعنی اجتماعی حالات ادب سے نہیں جھلکتے تھے البتہ انفرادی زندگی کا اظہار عام تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد کے حالات نے ہندوستان کے سیاسی سماجی حالات پر گہرا اثر ڈالا اور اس کا اظہارِ ادب میں بھی ہونے لگا۔ترقی پسند تحریک نے ادب کے فرسودہ پیمانے بدل دیے اور زندگی کے تمام موضوعات ادب میں برتے جانے لگے۔ان موضوعات میں سے منٹو نے جسے افسانوں کے لیے چنا وہ جنس ہے۔جنس کا موضوع صدیوں سے ادب میں استعمال ہو رہا ہے۔یونانی،مصری،ہندوستانی اساطیر میں یا الہامی کتابوں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ عورت اور مرد کا رشتہ یا تعلق ازلی و ابدی ہے۔جنسی مسائل نئے ادب کا حصہ کیوں بنے ؟منٹو کا خیال ہے :

> زیادہ تر جنسی مسائل ہی آج کے نئے ادیبوں کی توجہ کا مرکز کیوں بنے ہیں۔اس کا جواب معلوم کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں۔یہ زمانہ عجیب و غریب قسم کے اضداد کا زمانہ ہے۔عورت قریب بھی ہے،دور بھی ۔۔۔کہیں مادر زاد برہنگی نظر آتی ہے کہیں سر سے لے کر پیر تک ستر ۔۔۔کہیں عورت مرد کے بھیس میں دکھائی دیتی ہے کہیں مرد عورت کے بھیس میں۔[۹]

جب انسانی نفسیات کے حساس موضوعات پر تحریریں سامنے آئیں تو نام نہاد اخلاق کے محافظوں نے نئے ادب کی ہی اس بنا پر مخالفت شروع کر دی کہ یہ محض جنسی مسائل ہی پیدا کر رہا ہے۔یہاں بھی منٹو کا جواب منطقی ہے:

جو سمجھتے ہیں کہ نئے ادب نے جنسی مسائل پیدا کیے ہیں غلطی پر ہیں۔کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ جنسی مسائل نے اس نئے ادب کو پیدا کیا ہے۔اس نئے ادب کو جس میں آپ کبھی کبھی اپنا ہی عکس دیکھتے ہیں اور جھنجھلا اٹھتے ہیں۔[۱۰]

مغربی تہذیب کے اثرات ہندوستانی زندگی کے ہر شعبے پر مرتسم ہوئے۔سماجی،اخلاقی اقدار زیادہ متاثر ہوئیں۔منٹو نے بظاہر بے وقعت نظر آنے والے سماجی مسائل کو موضوع بنایا اور اُن میں پیدا ہونے والے تغیر کا ہر دو پہلوؤں سے جائزہ لیا۔سماجی زندگی میں تصنع،بناوٹ اور نمائش در آئی جسے منٹو نے کہیں طنزاً اور کہیں براہ راست موضوع بنایا ہے۔مثلاً ادب کا ہی موضوع لیجیے ادبِ جدید جن حالات کی پیداوار ہے اور جن بدلتی اقدار کا منظر نامہ پیش کرتا ہے یقیناً وہ ایک خاص نظریاتی سطح رکھنے والوں کو قبول نہیں تھا۔

منٹو نے ہمیشہ مجرم سے زیادہ جرم کی نوعیت کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔مثلاً ''عصمت فروشی''مضمون میں بھی اُن کا خیال ہے کہ ایسے حالات کو ختم کیا جائے جو ویشیا کو پیدا کرتے ہیں۔منٹو اس پر مزید تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ویشیا پیدا نہیں ہوتی،بنائی جاتی ہے یا خود بنتی ہے۔جس چیز کی مانگ ہوگی منڈی میں ضرور آئے گی۔مرد کی نفسانی خواہشات کی مانگ عورت ہے خواہ وہ کسی شکل میں ہو چنانچہ اس مانگ کا اثر یہ ہے کہ ہر شہر میں کوئی نہ کوئی چکلہ موجود ہے۔اگر آج یہ مانگ دور ہو جائے تو یہ چکلے خود بخود غائب ہو جائیں گے۔[۱۱]

ادیب کسی بھی معاشرے کا ہو وہ اُس معاشرے کے مخصوص رجحانات سے متاثر ہوتا ہے۔اُس کا شعور اور لاشعور یا اُس کا تمام تخلیقی عمل اُن رجحانات کے پیش نظر روبہ عمل ہوتا ہے اس لیے اُن مخصوص رجحانات کا اظہار اُس کے ہاں بالکل فطری معلوم ہوتا ہے۔سماجی اقدار کی اتھل پتھل کو بھی منٹو موضوع بناتے ہیں۔بظاہر یہ محسوس ہوسکتا ہے کہ وہ انسانی زندگی کے بڑھتے ہوئے مسائل و مشکلات کو کسی باقاعدہ نظام میں لاکر حل کرنے کی خواہش نہیں رکھتے ایسا بالکل نہیں ہے لیکن وہ جدید سہولیات کو انسانی فلاح کے لیے رائج کرنا چاہتے تھے نہ کہ اس لیے کہ انسان ان کا غلام ہو جائے۔مثلاً ''ترقی یافتہ قبرستان''میں انگریزی تہذیب کے اثرات کے اچھے برے پہلوؤں کا ذکر ہے۔مشرقی یا ہندوستانی مثبت اقدار کے انہدام میں مغربی تہذیب کو منٹو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں اور ہندوستانی معاشرت میں پائی جانے والی بدحالی بھی اُن کے موضوعات کا حصہ ہے۔ بڑے شہروں کے مسائل میں سے قبرستان میں جگہ حاصل کرنا بھی ایک مسئلہ ہے۔ مثلاً مردے کو دفن کرنے کے لیے پہلے اُس کی بیماری کی تصدیق،پھر ڈاکٹر سے موت کا تصدیق نامہ،قبرستان میں جگہ کا حصول،قبروں کی درجہ بندی اور پھر قبر کے نمبر کا حصول یہ سب جدید تہذیب ہی کی شرائط ہیں۔ایسے ہی دیگر سماجی موضوعات اُن کی تحریروں میں جگہ پاتے ہیں۔مثلاً بن بلائے مہمان یا عورتوں اور مردوں کا ایک دوسرے کو چھیڑنا(چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد،اور کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی) استحصال،ملمع سازی، نشہ آور اشیا کا استعمال اور اُن کے اثرات،سماجی تضادات وغیرہ پر اُنہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی کا خیال ہے:

> منٹو اس بات سے واقف تھا کہ انسانی نفس کی تہذیب کے لیے ضروری ہے کہ ظاہر داری،جھوٹ اور پارسائی کے سیاہ برقعوں کو اُتار کر اُنھیں ان کی اصلی شکل دکھائی جائے۔۔۔اور ساتھ ہی اُنھیں ذہنی طور پر اس سطح پر لایا جائے جہاں وہ خود سے نہ صرف آگاہی حاصل کرسکیں بلکہ وہ اپنی اصلی شخصیت اور جذبات پر پردہ ڈالنے کی کوشش بھی ترک کر دیں تاکہ اُن کے جذبات بگڑ کر تشدد یا کسی غیر فطری شکل میں نمودار نہ ہوں۔[۱۲]

منٹو کی ذاتی زندگی سے ایک بات کا شدید اظہار ہوتا ہے کہ منٹو انتہائی پرخلوص،حساس،کسی حد تک جذباتی اور انا پرست شخص

تھے۔سب سے اہم بات یہ کہ وہ انسانوں میں سچائی تلاش کرنے کے خواہش مند تھے، منافقت اُنہیں ناپسند تھی۔منٹو سماج کے ایسے ہی حساس موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں۔ اس ضمن میں اُن کے مضامین ''عصمت فروشی''، ''شریف عورتیں اور فلمی دنیا''، ''گناہ کی بیٹیاں، گناہ کے باپ'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ سماج جس وجود کو قابل مذمت ٹھہراتا ہے منٹو کو اُس سے ہمدردی ہے وہ تو ایسی وجوہات اور حالات ختم کرنے پر زور دیتے ہیں جو ایسے ''قابل نفرت'' انسانوں کی پرورش کرتے ہیں۔منٹو انسانیت کے منفی پہلوؤں کو ابھار کر مثبت اقدار کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔منٹو کے مضامین میں کہیں بھی نصیحت، وعظ یا اخلاقی اصولوں کی پاسداری کا درس نہیں ملتا اور نہ ہی ایسا کرنا ان کا ذہنی یا فکری مسئلہ تھا۔

اپنے عصر کی ترجمانی کے حوالے سے منٹو کا یہ بیان نہایت اہم ہے جو اُنہوں نے احمد ندیم قاسمی کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ''زندگی کو اُس شکل میں پیش کرنا چاہیے جیسی کہ وہ ہے، نہ کہ وہ جیسی تھی یا جیسی ہوگی یا جیسی ہونی چاہیے۔''[۱۳] یہاں منٹو کے تنقیدی شعور کو داد دیجیے کہ ایسا صائب مشورہ قاسمی صاحب کو ہی دیا جاسکتا تھا۔منٹو کی ایک اہم نقاد ممتاز شیریں نے جانے کیوں انھیں ایک اخلاقی فنکار لکھا ہے۔اُن کے اپنے الفاظ یوں ہیں ''منٹو درحقیقت ایک اخلاقی فنکار تھا۔''[۱۴] ممتاز شیریں کا اگر تو یہ کہنا ہے کہ وہ اخلاقی قوانین وضع کرنے اور اُن پر کاربند رہنے پر بضد تھے تو یہ بات ماننے میں تامل ہوسکتا ہے چونکہ منٹو کے لیے اخلاق کا اچھا یا برا ہونا مسئلہ نہیں تھا۔لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ وہ سماج کی نظروں میں گرے ہوئے کرداروں سے ہمارے دل میں ہمدردی پیدا کرتے ہیں اور کسی بھی اخلاقی فیصلے کے پیچھے چھپے سچ کو تلاش کرنے میں ہماری مدد کرتے ہیں تو وہ یقیناً اخلاقی فنکار ہے جو واعظ تو نہیں ہے لیکن حقیقت پسند ہے جو مصلح نہیں ہے مگر سچائی کا نباض ہے۔منٹو کے مضامین معاشرتی ناانصافی سے پیدا سوالات تہذیب سے پوچھتے ہیں۔اُن کا مضمون ''محبوس عورتیں'' یا ''سوال پیدا ہوتا ہے'' اس کی عمدہ مثال ہیں۔

منٹو کا عہد سیاسی انتشار اور معاشی کشمکش کا عہد ہے۔معاشی کشمکش اور سیاسی منظر نامے میں تبدیلی کو انقلاب روس نے مہمیز لگائی۔منٹو نے اپنے عہد کی اس سب سے بڑی سیاسی، سماجی اور اقتصادی تحریک یعنی مارکسزم کا مطالعہ بغور کیا ہے اور اُن نظریات کی کامیابی یا ناکامی کا جائزہ مخصوص ہندوستانی حالات میں بھی لیا ہے۔منٹو حالات میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کے لیے سب سے پہلے اخلاص کی موجودگی پر زور دیتے ہیں۔ہندوستانی سیاست میں جلیانوالہ باغ کے سانحہ نے ایک باغیانہ فضا پیدا کر دی تھی۔منٹو نے ایک بچے کی آنکھ سے اس سانحہ کو دیکھا تھا۔منٹو کے ہاں سیاسی موضوعات پر افسانے کم ہیں البتہ سیاسی موضوعات پر اُن کی کہانیوں میں ''نیا قانون'' اور ''سوراج کے لیے'' اہم ہیں۔منٹو نے اپنے عہد کے سیاسی منظر نامے کو اپنے مضامین میں وضاحت سے پیش کیا ہے۔یہاں بھی اُن کی باریک بین اور دوراندیش نگاہ اُن معاملات کا کھوج لگاتی ہے جو ہندوستانی معاشرت میں سیاست کے نام پر ناسور بن چکے ہیں۔ آزادی سے قبل کے موضوعات میں ہندوستانی سیاست اور مذہبی تقسیم کی منٹو نے سخت مخالفت کی ہے۔ اُنہیں سیاستدانوں سے نفرت ہے کیونکہ وہ اُن میں منافقت، جھوٹ اور اخلاص کی کمی دیکھتے ہیں۔ان کا یہ خیال درست ہے کہ سماج جو پہلے طبقات میں تقسیم ہے اُس کی مزید تقسیم ہندوستانی سیاستدان مذہب کی بنیاد پر کر رہے ہیں اور ایسا کرنا انسانیت کے لیے نقصان دہ ہے۔''ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ'' ہندوستانی سیاست میں موجود سیاسی رہنماؤں کی واضح تصویر ہے۔منٹو اُن کی نااہلیت کی تصویر کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ لوگ جو اپنے گھروں کا نظام درست نہیں کر سکتے، یہ لوگ جن کا کریکٹر بے حد پست ہوتا ہے، سیاست کے میدان میں

اپنے وطن کا نظام ٹھیک کرنے اور لوگوں کو اخلاقیات کا سبق دینے کے لیے نکلتے ہیں۔۔۔کس قدر مضحکہ خیز چیز ہے![۱۵]

منٹو کا خیال ہے کہ ہندوستانی سیاستدانوں میں اُس قابلیت اور خلوص کا شدید فقدان ہے جو ہندوستان کو حقیقی آزادی کی طرف لے جائے اور جس کی وجہ سے یہاں امن و آشتی کا معاشرہ پیدا ہو سکے۔ ہندوستان میں پھوٹ پڑنے والے مذہبی فسادات کے پیچھے بھی منٹو کو انہی سیاسی رہنماؤں کی ذاتی مفاد پرستی کا عنصر نظر آتا ہے۔''ایک اشک آلود اپیل'' میں منٹو ایسے عناصر کی نشاندہی کرتے ہیں:

> یہ وہ لوگ ہیں جو جنگلی لوگوں کی بربریت کو ازسرِ نو ہندوستان کی فضا میں تازہ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہندوستان کے ہر عضو کو مفلوج دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔ جو اپنی مادرِ وطن کو آزاد دیکھنے کے خواہشمند نہیں۔۔۔جو مکار ہیں، غدار ہیں، جن کی رگ رگ اور نس نس میں بدی کا خون موجزن ہے۔[۱۶]

تقسیم ہند کے بعد منٹو نے اپنی پوری توجہ پاکستان کے سیاسی حالات پر مرکوز کر لی اور پاکستانی معاملات میں بڑھتی ہوئی امریکی مداخلت پر اپنی تشویش کو مختلف طریقوں سے ظاہر کیا۔ منٹو کی دور اندیشی نے پاکستان میں امریکی مداخلت کے اثرات کا بغور جائزہ لیا اور ان مشکلات کا بھی اظہار کیا جو اس مداخلت کا منطقی نتیجہ تھا۔ منٹو نے پاکستانی سیاست اور سماجی شعبے پر ایک خاص قسم کی ملائیت کے بڑھتے ہوئے اثرات کا بھی جائزہ لیا اور چچا سام کے نام خطوط میں اس کا کھل کر اظہار بھی کیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے انسانی اقدار کو جس تیزی سے بدلا ہے اور ہر اک شے کو مارکیٹ اکانومی میں بدل دیا ہے منٹو نے چچا سام کے نام خطوط میں اُس کا بیباک اظہار کیا ہے۔ اسی طرح منٹو دنیا بھر میں امریکی پالیسیوں کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ دنیا میں امن قائم نہ ہو سکنے کی وجہ بھی مخصوص امریکی حکمتِ عملی ہے۔ ان خطوط میں منٹو نئے آزاد ملک پاکستان کی معاشی زبوں حالی کا بار بار ذکر کرتے ہیں اور اس کا موازنہ امریکہ کی خوشحالی اور بے پناہ دولت سے کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ منٹو سرمایہ دارانہ نظام پر بھی شدید تنقید کرتے ہیں۔

تقسیم سے قبل کے حالات میں کانگریس اور مسلم لیگ کے سیاسی کردار کو بھی منٹو نے طنز کا نشانہ بنایا۔ اُنہیں اِن دونوں جماعتوں کے قول و فعل کے تضاد پر اعتراض تھا۔ جس کا اظہار اُنہوں نے اپنے مضامین کے علاوہ اپنے افسانوں میں بھی کیا ہے:

> مسلم لیگ مسجد ہے، کانگریس مندر ہے۔ لوگوں کا یہی خیال ہے۔ اخبار بھی یہی کہتے ہیں، کانگریس سوراج چاہتی ہے، مسلم لیگ بھی۔ لیکن دونوں کے راستے جدا جدا ہیں۔ دونوں مل جُل کر کام نہیں کرتے۔ اس لیے کہ مندر اور مسجد ساخت کے اعتبار سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ میرا خیال تھا کہ یہ جو فساد ہو رہا ہے اس میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو جائیں گے اور اِن دونوں کے خون کا ملاپ جو مندروں اور مسجدوں میں نہیں ہوتا موریوں اور بدروؤں میں ہوگا۔ مگر تعجب ہوا، جب میرا یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا۔[۱۷]

پاکستان بننے کے بعد بھی منٹو مسلم لیگ کے سیاسی کردار پہ طنز کرتے رہے ہیں۔ چونکہ اُس وقت کے مسلم لیگی زعماء آمرانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ کر رہے تھے اور پاکستانی سیاست میں ہر طرح کے سیاہ و سفید کے مختار ہو چکے تھے اور پاکستانی سیاست پر مسلم لیگ کے لیڈروں کا قبضہ ہو چکا تھا:

> یہ جتنے ادیب اور شاعر بنے پھرتے ہیں اب ان کو چاہیے کہ ہوش میں آئیں اور کوئی شریفانہ پیشہ اختیار کریں۔۔۔

لیڈر بن جائیں۔۔۔صرف مسلم لیگ کے۔۔۔ جی ہاں،میرا مطلب یہی تھا کہ کسی اور لیگ کا لیڈر بننا فحش ہے بے حد فحش۔[۱۸]

تقسیم ہند اور پاکستان بن جانے کے بعد اس نئے ملک پاکستان میں لوٹ مار کا جو بازار گرم ہوا منٹو جیسا حساس فنکار اُس پر بھی بہت دلبرداشتہ ہوا:

پچھلے برس یوم استقلال پر ایک صاحب سوکھا ہوا درخت کاٹ کر گھر لے جانے کی کوشش فرما رہے تھے میں نے ان سے کہا، یہ آپ کیا کر رہے ہیں، یہ درخت کاٹنے کا آپ کو کوئی حق نہیں، آپ نے فرمایا۔''یہ پاکستان ہے، یہ ہمارا مال ہے''میں خاموش ہوگیا۔[۱۹]

ظاہر ہے اس بے حسی کا سوائے خاموشی کے اور کیا جواب ہوسکتا تھا۔منٹو سماج میں پائی جانے والی رجعت پسندی کے خلاف تھے۔پاکستان میں ہمیشہ مذہب کے نام پر لوگوں کے حقوق سلب کیے گئے ہیں اور جبر و تشدد اور استحصال کو فروغ دیا گیا۔منٹو نے مذہب کے نام پر کیے گئے حکومتی اقدامات پہ تیز و تند لہجہ میں نکتہ چینی کی ہے جس کا اظہار''چچا سام کے نام خطوط''اور''اللہ کا بڑا فضل ہے'' مضامین میں خاص طور پر اور دیگر مضامین میں عمومی طور پر کیا ہے۔منٹو اپنی نجی زندگی میں بھی رجعت پسندی، اوہام پرستی، کورانہ تقلید، ناانصافی، تنگ نظری،تنگ خیالی، بے لچک کٹر پن اور تعصب پسند نہیں برتتے تھے۔منٹو وسیع الخیال، روشن دماغ اور انسان دوست شخص تھے جو مذہبی عقائد اُن کی عقل کی کسوٹی پر پورے نہیں اُترتے تھے اُنھیں وہ بآسانی رد کر دیتے تھے۔البتہ بیشتر ترقی پسندوں کی طرح منٹو نے مذہب کی کبھی بھی توہین وتحقیر نہیں کی وہ ذاتی طور پر مذہبی مفاہمت اور رواداری کے قائل تھے۔

کشمیر کا ذکر منٹو کی کہانیوں کے علاوہ اُن کے مضامین میں بھی اکثر جگہ پر آیا ہے۔اس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ منٹو خود کشمیری ہیں۔انگریز ہندوستان کی تقسیم کرتے وقت کشمیر کے مسئلہ کو متنازع چھوڑ کر چلے گئے۔جس سے کشمیر کے عوام کے دکھ درد میں مزید اضافہ ہوگیا اور اب کشمیر کے مستقل کا فیصلہ کرنے میں''یو این او'' کی عدم دلچسپی اسے مزید الجھا رہی ہے۔منٹو اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

یو۔این۔او فیصلہ کرے گی۔

کس کا؟

ہماری قسمت کا۔

پہلے تو ایسے فیصلے خدا کیا کرتا تھا۔

اب ارضی جنت کا فیصلہ ارضی''دیوتا''کرے گا۔[۲۰]

دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا بھر کے معاملات میں امریکی اثر رسوخ میں اضافہ ہوا۔تقسیم ہند کے بعد تو پاکستان کے داخلی وخارجی معاملات میں واضح امریکی مداخلت ہونے لگی۔ دراصل امریکی اور یورپی اقوام نے پاکستان کو انقلاب روس کے دیگر ممالک تک پھیلاؤ کو روکنے کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ان سرمایہ دار اقوام کی قیادت امریکہ کے ہاتھ میں تھی ۔ اس طرح پاکستان میں اس امر کا خیال کیے بغیر کہ یہاں کا سماجی و معاشرتی ڈھانچہ جو ابھی کمزور تھا مزید خستہ حالی کا شکار ہو جائے گا،مغربی ممالک نے ایسے اقدامات کرنے شروع کر دیے جن کے نتائج میں پاکستانی معاشرے میں بے چینی ،تعصب، گھٹن اور سماجی تفریق کی

قباحتیں فروغ پا گئیں۔ اس کا ایک سبب تو منٹو خود یہاں کے لوگوں کو ہی سمجھتے ہیں۔مثلاً چچا سام کے نام پہلے خط میں جہاں وہ امریکی طرز معاشرت اور سرمایہ دارانہ نظام کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں وہیں وہ اپنے ملک کے لوگوں کی بے حسی کا احوال بھی لکھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ ہم نے خود اپنی صورتوں کو بگاڑ رکھا ہے۔ اتنا مسخ کر رکھا ہے کہ اب وہ پہچانی بھی نہیں جاتیں ہیں۔ منٹو کو اس بات کا احساس تھا کہ مغربی اقوام پاکستان کو مذہب کے نام پر روس کے خلاف استعمال کریں گی اور ایسے افراد کو بڑھاوا دیں گی جوان کے مقاصد تو بخوبی پورا کریں گے مگر ان کے ہاتھوں پورا پاکستانی سماج یرغمال بن کر رہ جائے گا:

> ہندوستان لاکھ ٹاپا کرے ۔آپ پاکستان سے فوجی امداد کا معاہدہ ضرور کریں گے۔ اس لیے کہ آپ کو اس دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے استحکام کی بہت زیادہ فکر ہے۔ اور کیوں نہ ہو اس لیے کہ یہاں کا مُلا روس کے کمیونزم کا بہترین توڑ ہے۔فوجی امداد کا سلسلہ شروع ہوگیا تو آپ سب سے پہلے ان ملاؤں کا مسلح کیجئے گا۔[۲۱]

اس طرح منٹو امریکی فوجی امداد کی فراغ دلانہ پیشکش کے اصل محرک کا پردہ فاش کرتے ہیں اور اس کے پیچھے چھپی امریکی نیت کو سامنے لے آتے ہیں۔ پاکستانی معاشرے اور اقتصادیات میں امریکی مداخلت کو ناپسند کرنے والوں میں منٹو بھی شامل تھے ۔ سلطانی جمہور کی داعی مسلم لیگ جلد ہی آمرانہ ہتھکنڈوں پر اتر آئی اور سرکاری پالیسیوں کے مخالفین کو سرخا قرار دے کر آزادئ اظہار کے تمام ذرائع پر قدغن لگانے لگی۔منٹو بھی سرکار کی ان بندشوں کا شکار ہوئے جس کا اظہار اُن کے مضامین میں اکثر جگہ پر ہوا ہے۔

تقسیم ہندوستان ایک ایسا جذباتی فیصلہ تھا جس نے ہر حساس اور باشعور فنکار کے قلب و ذہن پر گہرے اثرات مرتسم کیے۔ منٹو کبھی بھی کسی سیاسی جماعت سے نہ تو وابستہ رہے تھے اور نہ اُنہوں نے خود کو کسی سیاسی مسلک کا پابند بنایا تھا۔تقسیم سے قبل منٹو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سیاسی جماعتوں کو چند افراد کا ذاتی مفادات کے حصول کا گروہ خیال کرتے تھے جنھوں نے پورے ملک میں جذباتی فضا قائم کر رکھی تھی۔منٹو تقسیم ہند کے عمل سے بظاہر اس حد تک لاتعلق تھے کہ وہ اسے غیر فطری عمل قرار دیتے ہیں۔

> برطانوی سامراج کی حکمت عملی نے وہ شاطرانہ چال چلی کہ ٹھنڈے سے ٹھنڈے دماغوں کو بھی سوچنے کا موقع نہ ملا۔ ہندوستان کو اس چابک دست جراح نے پتھر کی سرد سلوں پر لٹا کر چیرا پھاڑا ایک سنگین سکون و اطمینان کے ساتھ اس کے حصے بخرے کیے اور یہ جا وہ جا۔اور وہ جن کے تدبر ،وہ جن کی دقیقہ رسی،وہ جن کی شاہیں نگاہی کی سارے عالم میں دھوم تھی، آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔[۲۲]

خود منٹو بدیشی حکمرانوں سے نجات تو چاہتے تھے مگر اُن کے گمان میں بھی نہ تھا کہ انگریزی تسلط ہندوستان کی تقسیم پر منتج ہوگا۔منٹو جیسے تخلیقی فنکار کے ہاں انگریزی تسلط سے آزادی کی خواہش تو اکثر تحریروں میں نظر آتی ہے لیکن تحریک پاکستان سے وہ لاتعلق نظر آتے ہیں۔منٹو تحریک آزادی کے عمل سے لاتعلق ہی رہے ہیں۔ بقول فتح محمد ملک:

> سعادت حسن منٹو بھی اپنے معاصرین کی طرح سیکولر اندازِ نظر کو وسیع النظری،انسان دوستی اور آفاقیت کی ماں تصور کرتے تھے۔اس لیے مسلمان قوم کی اس تہذیبی اور سیاسی جدوجہد سے وہ بھی سراسر لاتعلق رہے جسے تحریک پاکستان کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔وہ بھی اپنے نظریہ اور عمل سے یہی ثابت کرنے میں کوشاں رہے کہ برصغیر میں جداگانہ مسلمان قومیت کی بنیاد پر ایک علیحدہ مسلمان مملکت کے قیام کا مطالبہ رجعت پسندانہ مطالبہ ہے۔[۲۳]

درج بالا اقتباس میں جسے فاضل نقاد ''درست طور پر مسلمان قوم کی تہذیبی اور سیاسی جدوجہد'' قرار دیتے ہیں منٹو اُسے اپنا اُلو سیدھا کرنے کا عمل کہتے ہیں۔انہی کے الفاظ میں دیکھیے:

> یہ لیڈر جب آنسو بہا بہا کر لوگوں سے کہتے ہیں کہ مذہب خطرے میں ہے تو اس میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔مذہب ایسی چیز نہیں کہ خطرے میں پڑ سکے۔اگر کسی بات کا خطرہ ہے تو وہ ان لیڈروں کا ہے جو اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے مذہب کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔[۲۴]

اسی مضمون میں منٹو مزید ایسے لیڈروں کے کردار کو واضح کرتے ہیں جو ذاتی مفادات کے حصول میں کسی بھی قسم کی اخلاقی اقدار کو خاطر میں نہیں لائے۔اسی طرح منٹو پاکستان قائم ہونے کے چار سال بعد بھی اسے ''پر کاٹے ہوئے پرندے کی آزادی'' قرار دیتے ہیں۔چچا سام کے نام پہلے خط کا آغاز ہی یوں کرتے ہیں:

> میرا ملک ہندوستان سے کٹ کر کیوں بنا، کیسے آزاد ہوا؟ یہ تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہے یہی وجہ ہے کہ میں خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں، کیونکہ جس طرح میرا ملک کٹ کر آزاد ہوا اسی طرح میں کٹ کر آزاد ہوا ہوں اور چچا جان یہ بات تو آپ جیسے ہمدردان عالم سے چھپی ہوئی نہیں ہونی چاہیے کہ جس پرندے کو پر کاٹ کر آزاد کیا جائے گا اس کی آزادی کیسی ہوگی۔[۲۵]

تقسیم کے اس عمل کو جذباتی قرار دیتے ہوئے منٹو اس تقسیم کے نتیجے میں ہونے والے فسادات کو بھی ہدف تنقید بناتے ہیں۔فسادات میں منٹو کا رویہ اپنے بہت سے ہم عصروں کے برعکس انسان دوستی کا مظہر تھا۔منٹو ہندو یا مسلمان کے قتل کو محض انسان کا قتل خیال کرتے تھے:

> خود کو حیوانوں سے کچھ اونچا رکھنے کے لیے انسان نے قتل و غارت گری کے لیے بھی کچھ آداب و قواعد بنا رکھے ہیں۔لیکن جس قتل و غارت گری کا ہم ذکر کرتے ہیں ان آداب و قواعد سے بے نیاز تھی بلکہ یوں کہیے کہ حیوانیت سے بھی یکسر مبرا تھی جس کی تصویر شاید یہ قتل و غارت گری خود بھی نہ کھینچ سکے۔[۲۶]

فسادات کے موضوع پر منٹو نے کئی افسانے لکھے۔ان میں ''کھول دو'' کو لافانی شہرت حاصل ہوئی۔منٹو نے اپنے بعض مضامین میں فسادات کے بعد کی صورتحال کا تجزیہ بھی کیا ہے۔مثلاً فسادات میں اغوا ہوجانے والی پچاس ہزار سے زائد عورتوں کی بازیابی کے مسائل اور بازیاب ہوجانے والی عورتوں کے نفسیاتی علاج معالجے پر حکومتی توجہ مبذول کرائی ہے۔اسی طرح منٹو نے اُن افراد کے نفسیاتی علاج پر بھی زور دیا ہے جو فسادات کے زمانے میں ہر طرح کی لوٹ مار میں شامل رہے اور بے دریغ انسانوں کا خون بہاتے رہے۔منٹو ایسے حساس معاملات پر نظر رکھتے تھے جنھیں حکومت یا مقتدر حلقے قابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔

منٹو اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل پر اپنے نظریات کا اظہار بڑے بے لاگ طریقے سے کرتے ہیں۔منٹو کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے ذرائع ابلاغ سے مکمل آگاہی رکھتے تھے۔اخبارات و رسائل تو عام ہو چکے تھے۔اسی طرح ریڈیو بھی شہری زندگی کا حصہ بن چکا تھا۔مگر فلم کا میڈیا ابھی ہندوستان میں نیا نیا آیا تھا۔منٹو جلد ہی اس میڈیا سے منسلک ہوگئے اور فلمی کہانیاں اور مکالمے لکھتے رہے۔ایک طویل عرصہ تک فلم ہی سے منٹو کا روزگار وابستہ رہا اور یہ سلسلہ پاکستان آ کر

ٹوٹ گیا۔ اس جدید میڈیا کے مؤثر استعمال اور فلم کی تکنیک اور ضروریات کے بارے میں منٹو نے ہی اہم مضامین قلمبند کیے۔منٹو نے احمد ندیم قاسمی کے نام اپنے خطوط میں فلمی کہانی،مکالموں اور گیتوں کے لیے درکار معلومات کا بالتفصیل اظہار کیا ہے۔منٹو نے فلم بننے کے تمام مراحل کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا اور اپنے تجربات کو اپنے احباب تک پہنچانے میں فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔منٹو کی اس خوبی کا اظہار ڈاکٹر برج پریمی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> منٹو فلمی دنیا میں داخل ہو کر صرف اپنی تقدیر سنوارنے میں مصروف نہیں رہے بلکہ اُنہوں نے ایک نظر پیدا کر لی۔وہ بار بار اپنے احباب کو فلمی دنیا کے تمام داؤ پیچ سمجھاتے رہے۔انہوں نے دوسرے لوگوں کی طرح اس معاملے کو پیشہ ورانہ راز(Trade Secret) نہیں سمجھا۔ بلکہ اسے صلائے عام بنا دیا۔وہ اپنے احباب کو مشورہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔فلم کی تکنیک کے بارے میں باریک رموز سمجھاتے ہیں۔اس سے اُن کے مشاہدے اور مطالعے کا قائل ہونا پڑتا ہے۔[۲۷]

مثلاً فلم کی کہانی کیسی ہونی چاہیے؟اپنے ایک خط میں منٹو اس نکتے کو احمد ندیم قاسمی پہ یوں واضح کرتے ہیں:

> اسٹوری لکھتے وقت یہ امر ضرور پیشِ نظر رکھیئے گا کہ جو کچھ آپ کہنا چاہیں وہ آپ اپنے کیریکٹروں کے ذریعے سے Establish کراتے چلے جائیں۔مثلاً آپ لکھتے ہیں فضل بڑا ظالم تھا۔تو یہ چیز اسکرین پر دکھانے کے لیے ایک Incident کی ضرورت ہے۔فقط ڈائیلاگ سے کام نہیں چل سکتا۔سٹوری Smooth اور وقائع و مناظر سے بھری ہوئی ہو۔قدم قدم پر ایک Grip ہو۔[۲۸]

منٹو ہندوستانی فلم پر تبصرہ کرتے ہوئے خود کو بطور ایک ماہر نقاد کے تسلیم کرواتے ہیں۔فلمی زندگی سے متعارف تو منٹو ہفتہ وار فلمی رسالے ''مصور'' کی ادارت کی وجہ سے ہوئے تاہم جلد ہی وہ اس صنعت کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ ہو گئے۔منٹو نے فلمی دنیا سے جو تجربہ و مشاہدہ حاصل کیا اسے انہوں نے اپنی کئی کہانیوں میں بھی برتا۔مثلاً لتیکا رانی، بسم اللہ،مس مالا،میرٹھ کی قینچی وغیرہ ان فلموں کے واقعات،کردار اور پلاٹ فلمی دنیا سے اخذ کردہ ہیں بلکہ منٹو نے بعض فلمی شخصیات کے بہت دلچسپ خاکے بھی لکھے ہیں۔فلمی صنعت پر لکھے گئے مضامین میں منٹو ایک منجھے ہوئے فلمی نقاد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور ۱۹۱۳ء میں جب ڈی جی پھالکے نے ہندوستان میں پہلی فلم بنائی تھی،سے لے کر منٹو نے اپنے عہد تک بننے والی فلموں اور فلمی دنیا کے نشیب و فراز سے متعلق بھرپور آگاہی دی ہے۔منٹو ہندوستانی فلم کے کہانی نویسوں کو دوسروں کی چچوڑی ہوئی ہڈیاں کھانے والا سمجھتے ہیں۔منٹو کا خیال درست ہے کہ ہندوستانی فلم کو شروع سے ہی ایسے لوگوں نے سنبھالا جنھیں نہ تو اس کام کا تجربہ تھا اور نہ مطلوبہ ہنر حاصل تھا۔یہی حال فلموں میں کام کرنے والے اداکاروں کا تھا۔اسی طرح فلم سازی کی صنعت کے زوال میں فلمی صحافیوں کا بھی نمایاں کردار ہے۔چونکہ منٹو فلم کو ہی ایسا ذریعہ سمجھتے تھے جو خوابیدہ ہندوستانی ذہنیت کو جگانے کا کام کر سکتا ہے لیکن یہ اسی صورت ممکن ہے جب تیسرے درجے کی فلموں سے چھٹکارا حاصل کیا جائے اور فلم کو محض تفریح نہ خیال کیا جائے۔ بقول منٹو:

> عوام کو تعلیم یافتہ بنانے کے مختلف طریقے ہیں۔ان سب میں سے فلم کو متفقہ طور پر بہت بااثر تسلیم کیا گیا ہے۔سیلو لائڈ کے فیتے کے ذریعے سے ہم پبلک تک اپنا پیغام بطریق احسن پہنچا سکتے ہیں۔۔۔ جو بات مہینوں خشک تقریروں سے نہیں سمجھائی جا سکتی، چٹکیوں میں ایک فلم کے ذریعے سے ذہن نشین کرائی جا سکتی ہے۔[۲۹]

ہندوستان کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر منٹو کا خیال ہے کہ فلم کو تفریح مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ فلم بینوں کے دماغوں میں غور وفکر کے جراثیم بھی پیدا کرنے چاہئیں۔انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ یہ سب تب ہی ممکن ہے کہ جب فلمی صنعت پر سرمایہ لگانے والے تاجر عوام کی جیبوں پر ڈاکہ ڈال کر اپنی تجوریاں بھرنا چھوڑ دیں گے۔

منٹو نے فلم کی تکنیک سے بھی بحث کی ہے ۔اس وقت تک چند اہم سنگِ میل ہندوستانی فلمی صنعت عبور کر چکی تھی مگر اس میں کچھ ایسے طریقے رائج ہوگئے تھے جو اس صنعت کے لیے نقصان دہ تھے۔مثلاً کہانی میں بے جا طوالت،واقعات و حادثات میں بے ربطی، موقع بے موقع ناچ گانا،بعض غیر متعلق واقعات وغیرہ۔بقول منٹو فلم میں ''لنگڑا پن'' پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔فلم کی تکنیک کے علاوہ منٹو فلم بنانے میں دیگر افراد کے کردار کی اہمیت کو بھی واضح کرتے ہیں۔مثلاً وہ فلم کی تشکیل میں ہدایت کاروں کے کردار پر خاص زور دیتے ہیں۔منٹو کے بقول ہدایت کار کے لیے صاحب اسلوب ہونا بھی ضروری ہوتا ہے ۔منٹو مغربی ہدایت کاروں اور ان کے کام کے معترف ہیں۔منٹو فلم میں اداکاری کے فن پر بھی توجہ دینے کی ضرورت کا احساس دلاتے ہیں اور اداکاری کو بھی اتنا ہی اہم فن گردانتے ہیں جتنا کہ مصوری،سنگ تراشی، شاعری، افسانہ نگاری اور موسیقی وغیرہ کو سمجھا جاتا ہے۔فلمی صنعت کی ضرورت اور مؤثر ہونے کے اسباب اور فلم کی تکنیک اور دیگر ضروریات کے حوالے سے منٹو نے چند اہم مضامین قلمبند کیے ہیں۔جن میں ''شریف عورتیں اور فلمی دنیا''،''ہندوستانی صنعت فلم سازی پر ایک نظر'' اور ''زندگی''فلم پر ریویو اہم ہیں۔البتہ فلموں کی یکسانیت اور فلموں کی مصنوعی زندگی سے جلد ہی منٹو کا جی اُوب گیا اور ''میں فلم کیوں نہیں دیکھتا'' میں اس سب کا اظہار خوب کیا ہے۔ڈاکٹر برج پریمی کا خیال ہے :

> منٹو نے فلم کو ادب سے کمتر درجے کی چیز نہیں سمجھا تھا۔اُنھوں نے بہت خلوص سے اس وسیلے کے ذریعے خدمت کرنا چاہی تھی اور کسی حد تک وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔''مصور'' اور''کارواں'' کی ادارت کے دوران انہوں نے ایسا مواد شائع کیا جس سے فلموں میں صفائی اور سلیقہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔۔لیکن ہمیشہ فلمسازوں اور ار بابِ اختیار کی نااہلیت کے باعث مسخ ہوئیں۔[۳۰]

تقسیم سے قبل کے سیاسی،سماجی اور معاشرتی مسائل ہوں یا تقسیم کا پیدا کردہ المیہ منٹو کی تنقیدی بصیرت اور حالات کو سمجھنے کا شعور ہمیشہ درست تجزیئے میں اُن کے معاون رہے ہیں اور منٹو کبھی بھی اپنی بے لاگ رائے دینے سے نہیں ہچکچائے۔منٹو نے اپنے عہد کے اہم اور سلگتے مسائل پر قلم اُٹھایا ہے اور اُن مسائل کو ہر طرح سے اُبھارنے اور اُن کے تمام گوشوں کو سامنے لانے میں اپنی پوری بصیرت سے کام لیا ہے۔سیاسی موضوعات ہوں یا سماجی مسائل منٹو کے مضامین سے اُن کا عہد واضح طور پر جھلکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اختر حسین رائے پوری،ڈاکٹر،ادب اور انقلاب،نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۸۹ء،ص ۲۴

۲۔ منٹو،سعادت حسن ،لذت سنگ، نیا ادارہ،طبع دوم،س ن،ص ۱۲۵

۳۔ ایضاً،ص ۱۱۸

۴۔ ایضاً،ص ۴۱

۵۔ ممتاز شیریں،منٹونوری نہ ناری،شہرزاد کراچی،طبع دوم،۲۰۰۴ء،ص۱۳۶

۶۔ ایضاً،ص۱۳۶

۷۔ وارث علوی،منٹو ایک مطالعہ،وجے پبلشرز دہلی۱۹۹۷ء،ص۱۸

۸۔ منٹو،سعادت حسن،منٹو نما،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۳ء،ص۶۳۵

۹۔ منٹو،سعادت حسن ،لذت سنگ،نیاادارہ،طبع دوم،س ن،ص۱۲۰

۱۰۔ ایضاً،ص۱۲۲

۱۱۔ منٹو،سعادت حسن،منٹو نما،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۳ء،ص۵۸۸

۱۲۔ انور فردوس قاضی،ڈاکٹر،اردو افسانہ نگاری کے رجحانات،مکتبہ عالیہ لاہور،طبع دوم،۱۹۹۹ء،ص۳۰۶

۱۳۔ قاسمی،احمد ندیم ،مرتب:منٹو کے خطوط،کتاب نما راولپنڈی،طبع دوم ۱۹۶۶ء،ص۱۵

۱۴۔ ممتاز شیریں،منٹونوری نہ ناری،شہرزاد کراچی،طبع دوم،۲۰۰۴ء،ص۱۴۳

۱۵۔ منٹو،سعادت حسن،منٹو نما،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۳ء،ص۵۷۱

۱۶۔ ایضاً،ص۵۷۵

۱۷۔ ایضاً،ص۲۹۷

۱۸۔ منٹو،سعادت حسن،اوپر نیچے اور درمیان،گوشہ ادب لاہور،طبع سوم۱۹۸۴ء،ص۱۳

۱۹۔ ایضاً،ص۱۵۱

۲۰۔ ایضاً،ص۶۹

۲۱۔ ایضاً،ص۱۶۲

۲۲۔ ایضاً،ص۲۰۹

۲۳۔ منٹو،سعادت حسن،منٹو نما،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۳ء،ص۴۳۴

۲۴۔ فتح محمد ملک، پروفیسر،سعادت حسن منٹو کی پاکستانیت،مشمولہ ادبیات جلد۱۳شمارہ۵۵،۲۰۰۱ء،ص۱۱۲

۲۵۔ منٹو،سعادت حسن،منٹو نما،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۲۰۰۳ء،ص۵۷۲

۲۶۔ منٹو،سعادت حسن،اوپر نیچے اور درمیان،گوشہ ادب لاہور،طبع سوم۱۹۸۴ء،ص۱۵۵

۲۷۔ منٹو،سعادت حسن،منٹو نما،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۲۰۰۳ء،ص۴۳۵

۲۸۔ ڈاکٹر برج پریمی،منٹو کتھا،دیپ پبلی کیشنز جموں۱۹۹۴ء،ص۱۸۸

۲۹۔ قاسمی،احمد ندیم ،مرتب،منٹو کے خطوط،کتاب نما راولپنڈی،طبع دوم۱۹۶۶ء،ص۱۵

۳۰۔ منٹو،سعادت حسن،منٹو نما،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۲۰۰۳ء،ص۵۹۵

۳۱۔ برج پریمی،ڈاکٹر،منٹو کتھا،دیپ پبلی کیشنز جموں۱۹۹۴ء،ص۱۹۹